بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تبدیلی کے ہر مرحلے میں جو پاکستانی معاشرے کے دستوری اور سیاسی حالات میں پیش آتا ہے، مغرب پرست سیکولرسٹوں کی طرف سے اسلامی رجحانات کے خلاف پورا زور اس بات کے لیے صرف کر دیا جاتا ہے کہ وہ جس حد تک اثر انداز ہوتے اُس سے پسپا ہو جائیں، ورنہ کم سے کم ان کا کوئی قدم آگے نہ بڑھنے پائے۔

یہ قوتیں جو مسلم لیگ کے پرچم "لا الٰہ الا اللہ" کے نیچے جمع ہو گئی تھیں، وہ تقسیم کے بعد راتوں رات اس بات کو فراموش کر بیٹھیں کہ پوری تحریک کے قائد نے کیا وعدے قوم سے کیے ہیں اور ہندو اکثریت اور انگریزی سامراج کے سامنے پاکستان میں اسلامی تہذیب اور قرآنی قانون کو فروغ دینے کے اعلانات بار بار کر کے مستقبل کی کیا تصویر پیش کی تھی۔ اور اس سلسلے میں کیا دلائل دیئے گئے۔ یہی چیز تھی جس کی وجہ سے پاکستان تمام عالمِ اسلامی کی توجہات کا مرکز بن گیا کہ یہاں وہ انقلاب رُونما ہونے والا ہے جس کے لیے ملّت کا اجتماعی ذہن نسلوں سے خواب دیکھتا آ رہا تھا۔

اُسلام کے خلاف جاگیرداری، کمیونزم، بیوروکریسی اور تسلط یافتہ دانش وروں نے لادینیت پسندی کا ایک محاذ قائم کر لیا۔ اس غضبہ محاذ نے اپنے آپ کو پاکستان میں دستور سازی کے اوّلین مرحلے پر پوری طرح نمایاں کر دیا اور اس محاذ کا جو جرنل اور جو سپاہی جہاں جہاں مورچہ بند تھا، وہیں سے اس نے معرکہ آرائی شروع کر دی۔ دستور ساز اسمبلی، دفتری نظام، سیاسی قیادت، اخبارات، ادب اور ادارہ ہائے تعلیم، ریڈیو، خطابت کا پلیٹ فارم، غرضیکہ کوئی ایسا گوشہ نہ تھا جہاں سے

یہ سیلاب اُمڈ نہ پڑا ہو۔

اس سیلاب کی لہروں کے مقابلے میں چھوٹی سی ایک جماعت —— جماعتِ اسلامی —— نے جوابی سیلاب مطالبۂ دستورِ اسلامی کا اُٹھایا اور قلیل مدت میں، قلیل ذرائع کے ساتھ، اور حکومت کی زیادتیوں اور قومی پروپیگنڈہ مشینری کی مخالفتوں کے باوجود لادینیت کے سیلاب کا زور توڑ دیا۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی کو وہ قراردادِ مقاصد پاس کرنی پڑی جس کا اصل مفاد یہی تھا کہ دستوری لحاظ سے لادینیت کو ایک اُصول کے طور پر پاکستان میں جڑیں چھوڑنے کا موقع نہ ملے۔ خدا کی حاکمیت اور کتاب و سنّت کا برتر ماخذِ قانون اور معیارِ فیصلہ ہونا، یہ دو بڑی بنیادیں دستور کی قائم ہوگئیں اور اب تک قائم ہیں۔

پھر قراردادِ مقاصد پاس ہونے کے بعد، لادینیت پسندوں نے یہ کوشش شروع کی کہ اس دستوری اعلان کو برگ و بار نہ لانے دیا جائے۔ اسی کے لیے سرکاری حلقوں سے دوبارہ ایسے دستوری خاکے لائے گئے جو قراردادِ مقاصد کے "مقصد" کو کالعدم کرنے والے تھے۔ اس سلسلے میں ہمارے گورنر جنرل غلام محمد صاحب نے دستور کو توڑنے اور تمام دروبست اپنے ہاتھ میں لینے کا اقدام بھی کیا۔ لیکن قومی مطالبے کا دباؤ پھر بھی کم نہ ہوا۔ اور آخر میں دستور کے بنیادی اُصولوں کی کمیٹی کو علماء کی متفقہ ترامیم کے مطابق وہ خاکہ لانا پڑا جس پر دستور ۱۹۵۶ء مبنی تھا۔

دستور ۵۶ء سے جان چھڑانے کے لیے پہلی بار فوجی "بوٹ" ایوانِ حکومت میں داخل ہوئے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک لادینیت پسند طبقوں کی مدد سے ہر حکومت نے اسلامیت سے بھاگنے کی کوشش کی اور ہر بار عوام نے اُن کا تعاقب کر کے اُن سے نفاذِ اسلام کا دستوری یا قانونی وعدہ حاصل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری طرح گھر جانے کے بعد اُوپر والوں نے تاخیر و التوا کی پالیسی وضع کی جس کے خطوط یہ رہے کہ ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جو اِتنی مدّت میں مشورے دے گا اور پھر حکومت جن مشوروں کو قابلِ عمل پائے گی اُن کو اختیار کر لے گی۔ یعنی وعدہ اور پھر وعدہ، اعلان اور پھر اعلان۔ عملاً ماحصل کچھ بھی نہیں۔

اِس حکمتِ عملی کے ساتھ حکمرانوں نے مسلسل یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ وہ اسلام کے نعرے لگاتے رہیں، اُس کے نفاذ کے وعدے کرتے رہیں اور عملاً سیکولرازم کی راہ پر قدم بڑھاتے رہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اکابرنے یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ وہ نفاذِ اسلام کے سلسلے میں سامنے آنے والے مطالبوں کے متعلق بوقتِ "ضرورت" باقاعدہ اور صریحی طور پر مطالبہ کرنے والے لیڈروں سے قول وقرار اور یقین دہانیاں کر لیتے ہیں اور پھر کبھی چند مہینوں یا ہفتوں کے بعد اور کبھی چوبیس یا اڑتالیس گھنٹے بعد اپنے قول وقرار کے سکّوں کو خود ہی کھوٹا کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ گھنٹوں والی صورت تو حال ہی میں آٹھویں ترمیم پر ارکانِ اسمبلی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کے دوران میں بھی واقع ہوئی۔ یعنی گھڑی گھڑی کے الگ گھڑیال۔

صدر اور وزیراعظم دونوں اکابر نے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ متعلقہ دستوری دفعات میں ہمارے مطالبے کے مطابق مناسب تبدیلی کر کے نفاذِ شریعت اور شریعت کی بالادستی کی راہ ہموار کر دیں گے۔ مگر بیچ میں غالباً بیوروکریسی نے اڑنگا لگا دیا۔ اور قول وقرار تبدیل ہو گئے۔ اب ایک نئی صورت نکالی گئی کہ اس مدعا کا ایک عام ریزولیشن پاس کیا گیا کہ پارلیمنٹ اپنے آئندہ اجلاس میں "اسلامائزیشن" کا معاملہ طے کر دے گی۔ پھر مژدۂ جانفزا یہ کہ ایک "کمیشن" قائم ہو گا جو نفاذِ اسلام کے لیے نقشہ بندی کرے گا اور تجاویز اور مشورے دے گا۔ یعنی برسوں پہلے کے "کمیشن" سے چل کر پھر "کمیشن" پر آ گئے۔ بیچ میں جو ٹھوس کام بہ سلسلہ قانون سازی نہایت اچھے، معتمد اور تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ ادارے —— اسلامی نظریاتی کونسل —— نے کئی سال کی محنتوں سے مکمل کیا تھا وہ سارا داخلِ دفتر ہو گیا۔ تختی صاف کر دی گئی اور اب نیا قلم نئے سرے سے اِس ملک میں اسلام کی تقدیر رقم کرے گا۔ اور اس نئی تقدیر کا خاکہ بنانے کے لیے کمیشن قائم ہو گا۔

جناب ضیاء الحق صاحب نے مکمل اختیارات کے ساتھ نفاذِ اسلام کا جو کام کیا اس کے اجزا الگ الگ کر کے جو قیمت لوگ لگاتے رہے ہیں وہ بعض وجوہ کی بنا پر آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی اور آخر میں تو لوگوں کی اُمیدوں کے خواب اس حد تک پریشان ہوئے کہ مایوس لوگوں نے تو یہاں تک

سوچا کہ "چولہ لنڈہ راہی بھلا" ——— اور اس طرح لادینیت پسندوں کے لیے میدان اور زیادہ ہموار ہوگیا۔ یہاں تک کہ جی ۔ ایم سید ، خان ولی خاں اور غوث بخش بزنجو تو رہے اپنی جگہ ، اب ائیر مارشل اصغر خان تک دین و سیاست کی علیحدگی پر اپنی تازہ کتاب میں زور دار وعظ کر رہے ہیں۔

مارشل لا کے دور میں اسلامائزیشن کا جو تجربہ ہوا ، اس کی کمزوریاں حسب ذیل تھیں :

۱ ـــ یہ کام ایسے حالات میں ہوا کہ حکمران طاقت کے ساتھ حکومتی اور عوامی سطح پر کوئی ایسی ٹیم موجود نہ تھی جو ہم آہنگی سے مل کر اس کام کے لیے پورا زور ڈالتی ۔ فردِ واحد نے اس حال میں کام کیا کہ خود اس کی کابینہ اور اس کا سیکرٹریٹ اور اس کی ماتحت فورس کے اساطین اس کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہ رکھتے تھے ۔ اس لحاظ سے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔

۲ ـــ اتنے بڑے کام کے لیے جو حقیقت میں ایک انقلابی عمل ہے ، کوئی سوچا سمجھا منصوبہ موجود نہ تھا ۔ دوسرے لفظوں میں پروگرام میں کوئی ترتیب اور اولیات و ترجیحات کا کوئی نقشہ تیار نہ ہوسکا۔ جب جس چیز کو چاہا ، کسی بھی شکل میں ، کسی بھی جانب سے نافذ کر دیا گیا۔

۳ ـــ اسلامیت کے عنوان سے اور تدریج کے نام پر اسلام کے چند متفرق اجزا کو میدان میں بغیر فضا کو تیار کیے ڈال دیا گیا ۔ اس صورت میں ان اجزا کی اتنی بے وقعتی ہوئی کہ مثلاً شروع میں "عہدنامے" کی جو تحریک زور شور سے چلائی گئی ، اس کا اکثریت کے حافظے میں اب کوئی اثر تک باقی نہیں ہے ۔ عہدنامے کو جاندار بنانا تھا تو پھر ملازمت کی درخواست کے ساتھ ترقی پاکر کسی عہدہ پر جانے کی صورتوں میں ، پاسپورٹ کے حصول کے لیے اور دیگر ہر بڑے کام کے لوازم میں اس عہدنامے کو شامل کیا جاتا۔

۴ ـــ اوپر سے نیچے تک اسلامائزیشن کی جو مضبوط فضا بنائی جانی چاہیے تھی ۔ اس کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہ ہوسکا کہ صدر ضیاء الحق صاحب کی تقریریں ریڈیو ، ٹیلی وژن سے نشر ہوجائیں ۔ ایسے بڑے کام کے لیے میدان میں کوئی منظم جماعت نہ تھی ، جو انفرادی تلقینات کے ساتھ بڑی کانفرنسیں منعقد کرسکتی ۔ نیز جو کام غلط شکل اختیار کرلیں اور عوام کی بے اطمینانی کا باعث ہوں اُن کو پریس اور پلیٹ فارم سے مؤثر طور پر سامنے لاسکتی۔

۵ — اس پورے کام کا تعلق علماء سے بھی بہت گہرا تھا۔ ہر گروہ کے علماء کی متحدہ قوت کو ساتھ لینے کے لیے ضروری تھا کہ اُن کے ساتھ افہام و تفہیم کسی مستحکم بنیاد پر ہوتی۔ اس کے لیے بہترین صورت یہ تھی کہ اولاً ۳۱ علماء کے ۲۲ متفقہ اصولوں (۱۹۵۱ء) کو پیشِ نظر رکھا جاتا اور ثانیاً اُن کے ساتھ بیٹھ کر مشورہ کے بعد ان سے کوئی متفقہ اسکیم حاصل کی جاتی۔

بخلاف اس کے صدر صاحب نے علماء کے ساتھ ایک اور ہی نہج پر معاملہ کیا۔ یعنی دلخوش کن الفاظ اور متواضعانہ اندازِ گفتگو کے باوجود نظریاتی طور پر ان کی قیادت کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس ملک میں اسلامی عوامی حلقوں کی دستوری جدوجہد کے دوران میں اسلامی نظام کے متعلق جو تصور مستحکم ہو کر اتفاق و اتحاد کا ذریعہ بن چکا تھا۔ اس تصور کو ملیامیٹ کر دیا گیا اور امیر، شوریٰ، جمہوریت، انتخابات، ووٹنگ اور سیاسی پارٹیوں وغیرہ کے متعلق بالکل دوسرا تصور میدان میں ڈال دیا گیا۔ نفاذِ اسلام کرنے والی حکمران قوت نے جب نظریات سازی شروع کر دی تو اس کے سحر نے یہ اثر کیا کہ کچھ دینی عناصر صدر ضیاء الحق صاحب کے نئے تصور کے قائل ہو گئے اور اسے اسلام کی صحیح تر تعبیر تسلیم کر کے کتاب و سنت سے اس کے دلائل دینے لگے۔ اس طرح دینی قوت تقسیم ہو گئی۔ یہ بات مارشل لا کی حکومت کے نقطۂ نظر سے بہت مفید تھی۔ ایک تو دینی قوت کا دباؤ کم ہو گیا اور ایک حصہ سلطانِ وقت کا ہم نوا ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ نئے تصور کی ترویج کا فائدہ یہ تھا کہ فردِ واحد کی حکمرانی کو تقویت ملتی تھی۔ دینی عناصر میں بعض ایسے بھی تھے جو فلسفۂ غنیمت کے زیرِ اثر آ گئے۔ یہ فلسفہ ہمارے ہاں ہمیشہ دخل انداز رہا ہے۔ جب کسی حکومت کو ایک گروہ میں سے حامی قوت مل جاتی ہے تو پھر وہ اختلاف کرنے والی قوت کو وزن نہیں دیتی۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں نے دوسری جانب کے دینی حلقوں میں بددلی پیدا کی۔

اس طرح وہ دینی قوت جسے پوری نفاذِ اسلام کی مہم کی علمبرداری کرنی چاہیے تھی اور عوام میں اس مہم کی جڑیں اُتارنی چاہئیں تھیں، وہ افتراق کا شکار ہو گئی۔

۶ — عوام کی مظلومیت اور محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لیے جن اُمور کو خاص طور سے مقدم رکھنا چاہیے تھا۔ ان میں کسی ایک کا اشارہ تک سامنے نہیں آیا۔ چند طبقوں اور خاندانوں کا جو نظامِ جبر و استحصال ہمارے ہاں قائم ہے وہ اس کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ایسے میں سیرت کانفرنسوں کے انعقاد،

اقامتِ صلوٰۃ کے سفارشی حکم اور اجرائے حدود و تعزیرات کی بحثوں سے عوام کے دل کیسے متحرک ہو سکتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں تو تصورِ شریعت ہی بدل ڈالا گیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بس حدود و تعزیرات کا نام شریعت یا نظامِ اسلامی ہے۔ عوام کے اس تاثر نے احیائے اسلام کے برسوں میں کیے جانے والے پچھلے سارے کام کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اور اب یہ سوال درپیش ہے کہ لوگوں کے جذبۂ اسلامی کو ازسرِنو کس طرح متحرک کیا جائے اور اسلامی نظام کا صحیح تصور دوبارہ ان کے ذہنوں میں کیسے راسخ کیا جائے۔

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بہت بڑا نقصان ہے جو اسلام ہی کے نام پر اسلام کو پہنچا ہے۔

۷۔ اسلامی احکام جو سامنے آئے وہ نامکمل اور آمیزش یافتہ شکلوں میں سامنے آئے۔ اُن سے وہ اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو خدا اور رسولؐ کو مطلوب ہے۔

۸۔ ایک طرف نفاذِ اسلام کے اقدامات اور چرچے ہوتے رہے اور دوسری طرف مظالم، رشوت، خیانت، قتل، ڈاکے، اغوا، تاراجیِ عصمت، عیاشی، فحاشی، مغربی ثقافت ___ ہر فتنہ پہلے سے زیادہ تیز رفتاری سے بڑھتا چلا گیا۔

اِس تضاد کو دیکھ کر لوگ پریشان ہوئے، تھوڑا بہت چیخے، چلائے، مگر کوئی تحریک تو چلا نہ سکتے تھے، اس لیے کچھ نہ ہو سکا تو مایوسی کے غار میں چُپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے وہ بزرگ جو "ضیائیت" کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے، وہ بھی مراقبے میں چلے گئے۔

وہ اسلام کیا جو لوگوں کے دلوں میں نئی اُمنگ اور بہار پیدا نہ کرے۔

۹۔ اسلامائزیشن کا کام کرنے والی قوت کو اتنا مضبوط ضرور ہونا چاہیے کہ ہر ضروری چیز کو پہلے اپنے اُوپر، اپنے قریبی رفقا، اور اپنے ماتحت کام کرنے والی مشینری پر نافذ کر سکے۔

۱۰۔ اسلامائزیشن کا عمل کبھی بھی بغیر اس کے کامیاب نہیں ہو سکتا کہ اُوپر سے نیچے تک مختلف شعبوں کی سربراہی اور کارپردازی کے لیے ایسے لوگ مامور کیے جائیں جو اپنے معروف کردار اور کام کے ریکارڈ کے لحاظ سے سچے اسلامی جذبے سے کام کرنے والے ہوں۔ حتیٰ کہ ماتحت عملے میں بھی کم از کم صریحی مخالف ذہنیت رکھنے والے عناصر کی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ ضابطۂ ملازمت میں اس مقصد کے لیے ایک دفعہ کا شمول کافی تھا۔ مگر مارشل لا اور تو بڑے بڑے

معرکے سرکرتا رہا۔ بس یہ ایک ذراسی تبدیلی ضابطہ نہ ہو سکی۔

نتیجہ یہ کہ ماتحت عملہ تو کجا، شعبوں کے سربراہوں میں اسلام اور نظریۂ پاکستان کے مخالفین موجود ہیں۔ رہے عام ملازمین تو اُن کی اکثریت پچھلے سالوں میں اسلامی اصلاحات کا کھلے بندوں مذاق اُڑاتی رہی ہے۔

(۱۱) اس دور میں مختلف راستوں سے سیکولرسٹوں، کمیونسٹوں اور مخالفِ اسلام ادیبوں، نیز فلم اور ٹیلی وژن کے آرٹسٹوں، موسیقاروں اور ایکٹروں کو اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ کیا یہ سب کچھ نفاذِ اسلام کا تقاضا تھا۔

(۱۲) سب سے بڑی غلطی یہ کہ مارشل کے ڈنڈے سے اسلام کو آگے لانے کی ایک محدود سی کوشش کی گئی۔ حالانکہ مارشل لا قانونِ شریعت سے بالاتری اور خدا و رسولؐ کے دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کی وجہ سے خود اسلام سے سندِ منظوری حاصل نہیں کر سکتا۔ ڈنڈے کا اسلام تو کوئی اچھا اور گہرا اثر دلوں پر نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر مارشل لا کے ڈنڈے سے مزاحم اور منحرف قوّتوں کو روکنے کی جہاں جہاں ضرورت تھی، وہاں اس ڈنڈے کا سر مسلسل جھکا دیکھا۔

اِن سارے حقائق کا شعور رکھتے ہوئے ہمارا یہ رویّہ رہا کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی اچھی بات بھی سامنے آئے تو اُس کو محض اس وجہ سے مسترد نہ کر دیا جائے کہ ہمیں مجموعی نظام اور اسلامی اسکیم سے اختلاف ہے۔ اور ہمارا یہ رویّہ پہلے دن سے اسی طرح ہے۔ قراردادِ مقاصد پاس ہوئی تو ہم نے خیر مقدم کیا، حالانکہ ہم جانتے تھے کہ یہ قرارداد مقاصد بطورِ اعجاز اسلام کا نفاذ نہیں کر دے گی۔ تبدیلی صرف اتنی تھی کہ ہمارے لیے سعی و جُہد کا راستہ پہلے سے زیادہ کشادہ ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء کا دستور پاس ہوا تو ہم نے اسے اس بنا پر نیک فال سمجھا کہ اسلام کا کام کرنے کے لیے دستور نے جمہوری راستے بنا دیے ہیں۔ پی پی پی کی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تو اگرچہ اس سے اسلام کا نفاذ تو نہیں ہو جاتا تھا، مگر چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تبدیلی بے حد اہم تھی لہٰذا ہم نے اس پر خوشی محسوس کی۔ آخر اسی مقصد کے لیے مؤسسِ جماعتِ اسلامی اور اس کے قائد مولانا مودودیؒ پھانسی

کی کوٹھڑی تک پہنچے تھے۔ اپنی اسی مستقل اصولی پالیسی کے تحت ہم نے ہر اس تقریر، اعلان یا حکم کو ایک اچھا قدم قرار دیا جس میں اسلامیت کی ادنیٰ جھلک بھی تھی۔

مگر یوں نہیں ہوا کہ ہم سامنے آنے والے صرف متفرق اسلامی اجزا کی قصیدہ خوانی میں لگ گئے ہوں۔ بلکہ ہر مرحلہ پر تنقیدی انداز سے سامنے واضح کیا کہ ہونا کیا چاہیے اور مزید کن باتوں کی ضرورت ہے۔

نیز ہم نے نفاذِ اسلام کے جزوی، غیر مربوط، متفرق اور ناقص اقدامات کا محاکمہ کرتے ہوئے نفاذِ اسلام کی پوری صحیح اسکیم کو بھی ایک سے زیادہ بار واضح کیا۔

اِن چیزوں کا ریکارڈ موجود ہے۔ ہم نے ہر بار اپنی بات ایسے وانشگاف انداز میں کہی کہ ہم کو مارشل لا کی بی ٹیم قرار دینے والے اکابر تنقیدی باتیں ادھوری اور زیرِ لب ہی کہتے رہے اور وہ نفاذِ اسلام کی کوئی واضح اسکیم پیش کرنے سے بالکل قاصر رہے۔

ہمارے اُصول پسندانہ موقف کو اسی واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارے جو لوگ ابتدا میں اِس دعوت پر بطور وزیر شریک حکومت ہوئے تھے کہ آیئے اور حقیقی اسلامی نظام کو صحیح طور پر نافذ کرنے میں ہماری مدد کیجیے۔ وہ چند ماہ کے تجربے کے بعد اسی بنیاد پر مستعفی ہو گئے کہ اُن کے لیے صحیح اسلوب سے مؤثر کام کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ کمزوری اگر ذرا بھی ہوتی تو یہ لوگ عہدوں سے چمٹے رہتے، جیسے کہ دوسری مثالیں موجود ہیں۔

ہمارے عمائد کی طرف سے "ترکِ وزارت" کا اقدام بجائے خود اس بات کا اعلان تھا کہ حصولِ نصب العین کے لیے کام کرنے کا راستہ مسدود ہے۔

ہمارے جو دوست اب قومی ایوان میں پہنچے ہیں، ان کا مقصد عہدے یا مفاد حاصل کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ اسلام ہی کی خدمت کے لیے گئے ہیں اور اس کے لیے جمہوری راستے صاف کرانے کی کوشش میں لگے رہے ہیں۔

آٹھویں ترمیم اور اس کے بعد آنے والی نویں ترمیم کے سلسلے میں آزاد گروپ کے ساتھ جماعت اسلامی گروپ نے تعاون کر کے شدید مزاحمتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک طرف قابلِ قدر حد تک جمہوری اصولوں کو منوایا ہے اور دوسری طرف شریعت کی بالادستی اور اس کی تنفیذ کے لیے تازہ دستوری فیصلہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انتہائی مخالفتوں کے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے اس چھوٹے سے گروپ نے قدم آگے بڑھایا۔ کم سے کم اتنا ہوا کہ ایک ریزولیوشن اسمبلی نے پاس کر دیا جس کے تحت اگلے اجلاس میں چند متعین امور (جنہیں ریزولیوشن میں لایا گیا ہے) دستوری ترمیم کا حصہ بن جائیں گے۔

اچھا تو یہ تھا کہ یہاں تفصیلی تجزیہ کر دیا جاتا کہ کس پہلو سے دستور میں کہاں کہاں کیا مفید تبدیلیاں ہوئی ہیں، مگر اشارات کا پھیلاؤ پہلے ہی زیادہ ہو گیا ہے اور رسالے کے کم صفحات ان کے لیے باقی ہیں۔ تفصیلات اخبارات سے نہیں تو ہمارے اپنے شائع کردہ پمفلٹوں وغیرہ سے مل جائیں گی۔ خصوصاً پروفیسر خورشید صاحب کا انگریزی پمفلٹ آٹھویں ترمیم کے متعلق پڑھنا چاہیے۔

ذاتی طور پر میرا اپنا ذہن یہ ہے اور میرا خیال ہے کہ جماعت کے کم ہی ذی شعور لوگ مجھ سے اختلاف کریں گے کہ دستوری اور پارلیمانی مساعی جزء رہ جزء صرف راستے کھول سکتی ہیں یا رکاوٹیں دور کر سکتی ہیں۔ جہاں تک عملاً نفاذِ اسلام کے انقلابی کام کا تعلق ہے، تو وہ دعوت کی توسیع اور رائے عام کے چوطرفہ اور مسلسل دباؤ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں پہلے بھی ان اوراق میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ انتخابات اور اسمبلیاں بھی ہمارے لیے دعوت اور اثر اندازی کے میدان ہیں اور ان میدانوں کو بھی کبھی خالی نہ چھوڑنا چاہیے۔ لیکن اصل انقلابی عمل تو دعوتی اور تنظیمی اور تحریکی کام ہی کے زور پکڑ آنے سے ہو گا اور اسمبلیوں میں جانے والے دوستوں کے لیے قدم آگے بڑھانا اسی صورت میں ممکن ہو گا کہ باہر سے ان کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔

ہمارے کارکن یقیناً اتنے باشعور ضرور ہیں کہ وہ اس مغالطے کا شکار نہیں ہوں گے کہ بارہ پندرہ افراد کے قومی ایوان یا کچھ دوسروں کے صوبائی ایوانوں میں چلے جانے سے اسلامی انقلاب

: قیامِ نظامِ اسلامی کی ساری ذمہ داری ان پر عاید نہیں ہوجاتی ، بلکہ یہ اصل ذمہ داری آج بھی کارکنان ہی کی ہے ، اور انقلاب کی جو بھی لہر اُٹھے گی ، دیہات کی گلیوں سے ، کسانوں کی جھونپڑیوں اور کھیتوں سے ، کارخانوں سے ، دفتروں سے ، بازاروں سے ، درس گاہوں سے ، ——— اور خاکِ وطن کے ایک ایک ذرّے سے اُٹھے گی ۔

خدارا اس بھاری اور مسلسل جاری رہنے والی ذمہ داری کو ادا کرنے میں غفلت و تساہل سے کام نہ لیجیے ۔ اُٹھیے ، تگ و دو کیجیے اور آگے بڑھیے ۔

---

(۲)

ربیع الاوّل کا مبارک مہینہ قریب آلگا ہے ۔ یہ مہینہ ہماری انتہائی مسرت کا مہینہ اس وجہ سے ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن اس میں آتا ہے اور ہمارے اندر محبتِ رسولؐ کی شمع کی لَو تیز کر دیتا ہے ۔

برِّصغیر میں مذہبی تقاریب یا خاص دنوں کے ساتھ میلے ٹھیلوں کا جو انداز شامل ہو گیا ہے ، رسولِ برحق کی یادِ اُن سے بسا بلند ہے ۔ یہ چیزیں بالعموم اُس سرچشمۂ نور تک جانے والی راہوں کی دیوار بن جاتی ہیں ۔ اس دیوار کو ہم جذبۂ محبتِ رسولؐ ہی سے توڑ سکتے ہیں ۔ جائز طریقوں سے اور غیر متوازن سرگرمیوں اور اسراف سے بچ کر خوشی منانا برحق ، مگر اصل خوشی کی راہ یہ ہے کہ ہم محبتِ رسولؐ کے جذبے کی روشنی میں اطاعتِ رسولؐ کا مقام حاصل کر سکیں ۔ ہمارے افکار اور ہمارے نظریات ، ہماری کمائی اور ہمارے مصارف ، ہماری سیاست اور مالیات ، ہماری قدریں اور پیمانے ہمارا تصورِ انسان اور ہمارا اخلاقی شعور ، ہمارا ادب اور ہماری ثقافت رسولِ برحقؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کے سانچے میں ڈھل جائیں ۔

ہمارے اندر اس مبارک موقع پر یہ ارادہ اُبھرنا چاہیے کہ ہم اسی دعوت کو پھیلانے ، اسی تحریک کو موجزن کرنے اور اسی نظامِ عدل و احسان کو رائج کرنے کے لیے سعی و جہد کریں جس کے لیے حضورؐ نے اپنی ساری توانائیاں صرف کیں اور ساری عمر قربانیاں دیں ۔ نیز اس کام کے لیے ہم شرک کی

ہر صورت کے خلاف اور طاغوت کی ہر سرگرمی کے خلاف جہاد جاری رکھیں ___ نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو ملیامیٹ کرنے کے لیے متحد و منظم ہو کر تمام تدبیریں اختیار کریں۔

کم سے کم اتنا تو ہو کہ ہر بار ربیع الاوّل کے آنے اور یادِ میلاد تازہ کرنے کے نتیجے میں ہر مرد و زن کم سے کم اپنی زندگی میں سے کوئی ایک ایسی چیز تو خارج کرے جسے حضورؐ نے منع فرمایا اور کوئی ایک ایسی چیز قبول کرے جسے حضورؐ نے لازم ٹھیرایا۔ محبتِ رسالت کا یہ ادنیٰ ترین عملی اظہار ایک ایسی تبدیلی کا پیرایہ آغاز بن سکتا ہے جو دیر سویر آدمی کو ایمان و اسلام کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

اگر اس کم سے کم درجے کی اصلاح پذیری اور فلاح یابی کے بھی ہم مستحق نہ بن سکیں تو پھر ہجوموں اور جلوسوں اور نعتوں اور قوالیوں اور جھنڈیوں اور محرابوں سے اسلام کا کیا واسطہ، اور ہمارے کھوکھلے اظہارِ مسرت کی خدا اور رسولؐ کے یہاں کیا قدر!

ربیع الاوّل کا مرکزی پیغام قرآن کے ان مبارک الفاظ میں ہمارے سامنے ہے کہ:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔

تصحیح

ترجمان القرآن ستمبر ص ۱۳ میں النسائی کی شائع شدہ روایت میں غلطیاں رہ گئی ہیں تصحیح کر لیں۔

- سطر ۲ میں صحیح عبارت یوں ہے۔ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِخَیْرِ النَّاسِ وَشَرِّ النَّاسِ۔ (یہاں مضمون میں ہے وَاَبْشَرِ النَّاس۔)

- سطر ۳ میں صحیح لفظ ہے: بَعِیْرِہٖ (لکھا گیا تھا: بَعَیرِہٖ)

- سطر ۴ میں صحیح لفظ ہے: یَاْتِیَہُ الموتُ (لکھا گیا تھا: یاتیہِ الموتُ)

- سطر ۴ ہونا چاہیے تھا: رَجُلًا فَاجِرًا (یہاں فاجِراً چھوٹ گیا تھا)

- سطر ۵ میں صحیح عبارت: یَرعوی اِلٰی شَیْءٍ مِّنْہُ (یہاں یوں لکھا گیا: یرعَوِی بِشَیْءٍ مِنْہُ)